اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ محض ایک "قوم" بن کر رہ جائے تو یہ دراصل مسلمان ہونے کی حیثیت سے اِس کے وجود کی نفی ہے۔

خلاصۂ بحث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اُمتِ مسلمہ کی بہ حیثیت جداگانہ تنظیم، اور ایک مستقل معاشرے کی حیثیت سے اِس کی تاسیس، اور غیر مسلم معاشرے سے اُس کی قطعی علٰحدگی اگرچہ یکلخت نہیں بلکہ بتدریج کئی سال میں ہوئی۔ لیکن دعوتِ اسلامی کا آغاز جس ڈھنگ پر ہوا تھا، اُس سے لوگوں نے ابتدا ہی میں یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ تحریک کس رُخ پر جا رہی ہے اور آخر کار یہ کیا رنگ لائے گی۔ اسی لیے پرانے جاہلی معاشرے کو جو لوگ بھی باقی رکھنا چاہتے تھے وہ سب اِس پر بھڑک اُٹھے اور اپنے درمیان سے اِس نئی اُمت کے اُبھرنے کو روکنے کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

فصل ہفتم

نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے، کیونکہ یہاں پہنچ کر ایک نبی اور غیر نبی کی قیادت اور اس کے طریقِ کار کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے اُس وقت دنیا میں بھی، اور خود آپ کے اپنے ملک میں بھی بے شمار اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ روم اور ایران کے سامراج بھی انتہائی جابرانہ شان کے ساتھ موجود تھے۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ کمزوروں پر زبردستوں کا ظلم بھی بے تحاشا جاری تھا۔ ہر طرح کا ناجائز معاشی استحصال بھی ہو رہا تھا۔ بدترین اخلاقی برائیاں بھی پھیلی ہوئی تھیں، حتّٰی کہ عبادت خانے تک فواحش کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عرب ان سب ملکوں سے زیادہ پیچیدہ مسائل سے دوچار تھا جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ملک میں رہنے والی اور ایک ہی زبان بولنے والی قوم، جس کے اندر نسل و نسب کے باہمی رشتے بھی موجود تھے، بے شمار قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر "عرب قوم" کا تصور سرے سے ناپید تھا۔ لوگ اپنے قبیلے ہی کو اپنی قوم

سمجھتے اور کہتے تھے۔ ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی، خانہ جنگی، بدامنی، جہالت، اخلاقی پستی، ظلم و ستم، بھوک اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ بیرونی طاقتیں عرب کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کے اندر گھسی چلی آ رہی تھیں۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رُومی تسلّط پہنچ چکا تھا اور رومی قیصریت اندرون ملک میں روپیہ اور مشنری پھیلا کر اپنے اثرات کو وسعت دے رہی تھی۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حَبَش کی عیسائی سلطنت مدتوں یمن پر حملے اور قبضے کرتی رہی، حتیٰ کہ ایک مرتبہ مکہ تک بھی اس کی فوجیں پہنچ گئیں۔ ایران عرب کے مشرقی ساحل اور کچھ اندرونی علاقوں پر تو اپنا تسلط جما ہی چکا تھا، بعد میں یمن تک بھی اس کا اقتدار پہنچ گیا۔ حجاز میں اکثر و بیشتر زرخیز حصوں پر باہر سے آئے ہوئے یہودی صدیوں سے قابض تھے اور اپنی سودخواری کے جال میں انہوں نے عربوں کو پھانس رکھا تھا۔

اِس حالت میں اگر کوئی مصلح قسم کا لیڈر عرب سے اُٹھتا تو وہ اپنے کام کا آغاز یا تو جاہلانہ رسموں، اخلاقی خرابیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں کو روکنے کی کوششوں سے کرتا۔ یا پھر امیری و غریبی کا مسئلہ اُٹھا کر غریبوں کو امیروں سے بھڑا دیتا، تاکہ عام لوگوں کی بھوک مٹے اور افلاس دُور ہو۔ اور اگر کوئی سیاسی قسم کا لیڈر اُٹھتا تو وہ عربوں کو یہ لالچ دے کر اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا کہ میں تم کو ایک طاقتور قوم بناؤں گا، بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا، عرب کو ایک بڑی سلطنت بنا دوں گا، تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دوں گا، تمہارے وسائلِ معیشت بڑھا دوں گا، تمہاری بھوک مٹاؤں گا اور طاقت حاصل کر کے گرد و پیش کے ممالک پر تاخت کروں گا، تاکہ تم پر دولت کی بارش ہو۔ اس سارے کام میں اخلاق کا کوئی سوال درمیان میں نہ آتا، اور وہ اپنی سیاسی قیادت کو کامیاب بنانے کے لیے کسی چال، کسی جوڑ توڑ، کسی ہتھکنڈے، کسی زور زبردستی، اور کسی کشت و خون سے کام لینے میں ذرا تامّل نہ کرتا۔ پھر بنیادی طور پر دونوں قسم کے لیڈروں کی قیادت ایک قوم پرستانہ قیادت ہوتی۔ اپنے قبیلے کی عصبیت سے وہ بہت اُونچے اُٹھتے بھی تو زیادہ سے زیادہ عربی عصبیت تک پہنچ جاتے۔ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں تک اُن کی نظر پھیلتی بھی تو عربی مفاد کے لیے پھیلتی، "انسانیت" کے وسیع تر تصور تک اُس کی رسائی محال تھی۔

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار اب ذرا اللہ کے بھیجے ہوئے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔ حالات اور مسائل وہی سب کچھ تھے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، اور وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے جنہیں بالکل ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حضورؐ نے بھی ان کو ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ وقت آنے پر اُن میں سے ایک ایک کو آپ نے

حل ہی نہیں کیا بلکہ وہ انقلاب عظیم برپا کر کے دکھا دیا جس کا کوئی غیر نبی مصلح یا سیاسی لیڈر تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے کام کے آغاز میں ان سب سے قطعی صرفِ نظر فرما کر اپنی پوری توجہ صرف ایک بنیادی اصلاح پر مرکوز کر دی جو انسانی زندگی کے سارے مسائل کو حل کرنے کی ایک ہی کلید تھی۔ اگرچہ آپ ایک قبیلے اور ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسلامی تحریک کے پہلے روز ہی سے آپ کے پیشِ نظر نہ قبیلہ تھا، نہ قوم، نہ ملک نہ وطن، بلکہ پوری نوعِ انسانی پر آپ کی نگاہ تھی جس کو آپ ایک صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھے تھے، اور سب مسائل کو چھوڑ کر جس بنیادی اصلاح پر آپ نے اپنی کوششیں مرکوز کر دی تھیں وہ یہ تھی کہ:

۱۔ لوگ توحید پر ایمان لائیں، سب کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی اختیار کریں اور اسی کے حکم کو واجب الاتباع قانون مانیں۔

۲۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانیں اور اُس ہدایت، تعلیم اور آئین و قانون کی اطاعت کریں جو اللہ کی طرف سے اُن کے ذریعہ پہنچے۔ رسولؐ پر اس ایمان سے خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ بھی مستثنیٰ نہ تھے، کجا کہ کوئی اور ہو سکتا۔

۳۔ قرآن کو اللہ کا کلام مانیں اور اس کے فرمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب الاذعان تسلیم کریں۔

۴۔ آخرت پر ایمان لائیں اور یہ سمجھتے ہوئے دنیا میں کام کریں کہ آخر کار مرنے کے بعد ہمیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

۵۔ اخلاقی حسن و قبح کے اُن ناقابلِ تغیّر اصولوں کی پیروی اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے پیش کیے ہیں۔

۶۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی اِس دعوت کو قبول کر لیں وہ ایک ایسی اُمّت بن جائیں جو اِس دعوت کی علمبردار بن کر اُٹھے، اِس کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے پر تیار ہو جائے، آپس میں پوری طرح متحد ہو، اور اپنا ایک مستقل معاشرہ بنا کر کفر اور کفار سے قلبی محبت اور عملی معاشرت کے تعلقات توڑ لے۔

اس طریقِ کار کی اہمیت ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر صرف اس ایک بنیادی اصلاح پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ یہی امرِ حق ہے اور رسول کا اصل کام حق ہی پیش کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی اصل علّت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھنا، اور آپ اپنا اِلٰہ بن جانا یا اِلٰہ العالمین کے سوا کسی

دوسرے کو خدائی اوصاف و اختیارات یا حقوق کا حامل تسلیم کرنا ہے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ خرابی جب تک جڑ میں موجود رہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا تو کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہوسکتا ہے تو صرف اِسی چیز سے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری و غیر جواب دہی کی ہوا نکال دی جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اِس کا ایک بادشاہ (SOVEREIGN) موجود ہے اور تُو اُس کی پیدائشی رعیت (BORN SUBJECT) ہے۔ اُس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے مٹ سکتی ہے اور نہ تو اُس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اِس اَمِٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اُوپر عائد ہوگا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تو سیدھی طرح اُس کے آگے سر جھکا دے اور بندۂ مطیع (مسلم) بن کر رہے۔ دوسری طرف اُس کو حقیقت کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اِس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کل ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ درحقیقت کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تُو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اُسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اُسی کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف اُسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اُسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی شاہ و شہنشاہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی مشکل کشا، کوئی دعائیں سُننے والا اور کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری اور فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مَولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔

یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اِسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھیڑ کر از سرِنو ایک خاص نقشے پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک

پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اِسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی دعوت کا طریقِ آغاز

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اُس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لیے جائیں، پھر اُن اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اِس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اُٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اِس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اِس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آدمی کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں اُس کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو بُلانے والے کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سُن کر ہی آئیں، اِسی چیز میں اُن کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اَساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کے تصور کی وسعت

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اِس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیّت و اُلوہیّت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اَساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا مؤذنوں کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اِس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ میں کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد موجود الوقت پورے نظام سے بغاوت اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام تعمیر کرنا ہے تو یقین جانیے کہ اِس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

اس طریقِ کار کی کامیابی کے اسباب

یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عَلانیہ یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی

اِس پکار کی ضرب پڑتی تھی، وہ اِس آواز کو دبانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں اور پروہتوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اِس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوّق کا، رسم پرستوں کو اپنی رسوم کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقے کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے لُوٹنے کا خطرہ اِسی ایک آواز میں محسوس ہوا۔ اس لیے الکفر ملّۃ واحدۃ کے مصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اِس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اِس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اُس کی خاطر آگ میں کُودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اِس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا، کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت، ریاست، غرض ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ اِن کا آنا ضروری تھا۔ اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔

کام کے آدمی چھانٹنے اور اُنہیں تربیت دینے کا فطری طریقہ

اِن کا لازمی فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے، کمزور سیرت و کردار اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اِس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اِس بھٹّی میں سے گزر کر آئے۔ پھر جو لوگ آئے اُن کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی سہا صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے سہا۔ اِسی کے لیے وہ پٹے۔ اِسی کے لیے وہ بھوکے مرے۔ اِسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ اُن کے اندر مضبوط اور قابلِ اعتماد اسلامی کردار پیدا ہوا۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اِس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اُٹھتا ہے اور اُس کی خاطر کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید،

فاقہ، جلا وطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اِس ذاتی تجربے کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و رُوح پر چھا جاتی ہیں اور اُس کی پوری شخصیت اُسی مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے سب سے پہلے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دُور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے۔ جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اُس کی حاکمیّت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں وہ مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے۔ اُس کا عالِمُ الغَیبِ والشّہادہ ہونا، اُس کا مالک یوم الدین ہونا، اُس کا قاہر فوقَ عبادِہ ہونا پوری طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے، اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کسی کی اطاعت کا خیال تک ان کے دلوں میں نہ آئے۔

اسلامی دعوت کے پھیلنے کے وجوہ

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اِس طرح ہو رہی تھی، اور دوسری طرف اِسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند لوگ پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب اُنہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اِس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہو گئی ہوئی ہے، تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور اِس سے انسانی زندگی میں اِس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اِس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت، حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو اُن کی آنکھیں کھُل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوتے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اِس پس منظر میں یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبّر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراضِ دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اِس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی دیر تک اِس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اِس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

حضورؐ کی سیرت کا غیر معمولی اثر

اِس دوران میں تحریک کے رہنما صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ہر بات، ہر فعل

اور ہر حرکت سے اسلام کی حقیقی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہ رضؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار خاتون تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو اُن کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا۔ کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اِس تحریک کے پھیلانے میں چند سال کے اندر لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب سنہ ۱۰ بعدِ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسّر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے۔ دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے — بشرطیکہ آپ اِس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اُٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہوگیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ اِنہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اُونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے اور خاندان کسی کے مفاد کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ آپ کے لیے ایمان لانے والے غیر اپنے تھے، اور ایمان نہ لانے والے اپنے غیر تھے۔ اسی چیز نے دنیا کو آپ کی حق پرستی کا قائل کیا۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر ملک اور ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشموں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچا لوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، روم کے صُہیبؓ، اور ایران کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی۔ ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔